مولانا محمد عبدالشکور فاروقی (۱۲۹۳ھ-۱۳۸۱ھ/۱۸۷۶ء-۱۹۶۲ء) لکھنوی کی مکتوب نگاری

ظفر اقبال*

Maulana Abd al. Shukur Lakhnavi was a famous religiois scholar who sepnt his life for the sake of Islam. He defended believes and rituals Islam in a unique theological petter. His academic contribution in religious literature is also commendable. His lettets addressed to dignitories, religious scholars, friends, relatives and common men valuable from the perspective of academic and religious guidance. His multidimensional discussions and topics of these letters make them very beneficial for students, reseachers and scholars. In my letters he seems as a preacher of Islam who has deep love for his religion and has aimed to defend it. In some letters he is a great debator who puts his viewpoint with powerful arguments. In some letters, he is a good friend who is expressing his deep sorrow on demise of any relative of.friends. In some.letters he is sufi saint who is disclosing secrets of spirtual life. This article gives handsome information about his letters' methodology, subjects and literary patterns

بر عظیم کی دینی، علمی، فقہی، کلامی، متصوفانہ، تصنیفی اور درسی تاریخ خانوادہ شاہ ولی اللہ اور علمائے فرنگی محل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ شاہ ولی اللہ، ان کے خانوادے، ان کی تصانیف، تراجم اور فکر و فلسفے پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے،[۱] لیکن علمائے فرنگی محل کی ہمہ جہت اور متنوع خدمات کا موضوع، چند مستثنیات کے باوصف،[۲] وسعت، دقت نظری اور تفحص کے ساتھ موضوعِ تحقیق بنائے جانے کا اب تک منتظر ہے۔ مسلمانانِ بر عظیم کی دینی، علمی اور سماجی زندگی پر علمائے فرنگی محل کے احسانات اتنے زیادہ اور اثرات ایسے گہرے ہیں کہ اب تک اس خانوادے کی خدمات کی مختلف جہات پر مبسوط تصانیف اور مقالہ جات کا معتد بہ ذخیرہ اشاعت پذیر ہو جانا چاہیے تھا۔ اس عظیم خانوادے کی تاریخ ضلع بارہ بنکی صوبہ اُتر پردیش کے ایک گم نام قصبے ''سہالی'' سے شروع ہوتی ہے

ایم فل ریسرچ سکالر، شعبہ فلاسفی، جامعہ کراچی

۔ یہاں اپنے وقت کے ایک جید عالم، باصفا صوفی اور عظیم استاذ ملا قطب الدین شہید (۱۰۴۰ھ-۱۱۰۳ھ/ ۱۶۳۰ء-۱۶۹۱ء) مسند آرائے درس تھے۔ ایک عظیم خلقت نے آپ سے کسبِ فیض کیا ہے، محققین اور تذکرہ نگاروں کے مطابق: ''اکثر علمائے ہند کا سلسلہ تلمذ ملا قطب الدین سہالوی تک تمام ہوتا ہے''۔[۳]

علمائے فرنگی محل کے ممتاز فضلا میں سے ایک ایک عالم اس لائق اور اس کی خدمات و تحقیقات اس قابل ہیں کہ خود انھیں بحث و تحقیق کا مستقل موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ متاخرین میں اگر مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی (۱۰۹۰ھ-۱۱۶۱ھ/ ۱۶۷۹ء-۱۷۴۷ء) کی بلند پایہ تصنیفات و تحقیقات کا جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے صرف اڑتیس سال عمر پائی، درس و تدریس میں ہمہ وقت انہماک کے ساتھ دینی علوم کی مختلف جہات پر کیفیت کے لحاظ سے انتہائی نادر اور مثالی تحقیقات اور کمیت کے اعتبار سے اتنی مختصر عمر میں ایک سو چار تصنیفات کا صدور فردِ واحد سے کس طرح ممکن ہے؟ ان تصانیف نے علمائے عرب[۴] سے لے کر دانشورانِ فرنگ[۵] تک کو متاثر کیا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں مسندِ تدریس کو ان ہی کے شاگرد، تربیت یافتہ بلکہ جانشین مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی (۱۲۷۴ھ-۱۳۴۳ھ/ ۱۸۵۸ء-۱۹۲۵ء) نے سنبھالا۔ مولانا حیدر آبادی بہ یک وقت درس و تدریس، منقولات و معقولات اور رشد و سلوک کے جامع اور سادگی، زہد و قناعت کی تصویر تھے۔ تجرد کی زندگی اختیار فرمائی۔ آپ لکھنؤ میں ایک دینی ادارے ''مدرسہ عالیہ فرقانیہ'' کے بانی تھے۔ طالبانِ علوم کی ایک کثیر تعداد آپ سے فیض یاب ہوئی۔[۶]

مولانا محمد عبدالشکور فاروقی لکھنوی (۱۲۹۳ھ - ۱۳۸۱ھ/ ۱۸۷۶ء - ۱۹۶۲ء) آپ ہی کے شاگرد بلکہ جانشین تھے۔ مولانا لکھنوی نے آگے چل کر اپنی متنوع دینی خدمات، عملی مساعی اور سرگرمیوں کے باعث اپنے استاذ مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی کی زبان سے ''امام اہلِ سنت'' کا خطاب پایا، جو بعد میں مولانا لکھنوی کے نام کا جز بن گیا۔[۷]

مولانا لکھنوی کے والد مولانا ناظر علی (۱۲۶۰ھ-۱۳۲۸ھ/ ۱۸۴۴ء-۱۹۱۱ء) کی خواہش تھی کہ ان کے صاحبزادے کو مولانا عبدالحیٔ فرنگی محل (۱۲۶۴ھ-۱۳۰۳ھ/ ۱۸۴۸ء-۱۸۸۶ء) سے تلمذ کی سعادت حاصل ہو، لیکن ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا محمد عبدالشکور لکھنؤ پہنچے تو مولانا عبدالحیٔ کا انتقال ہو چکا تھا، لہٰذا انھیں مولانا عبدالحیٔ کے جانشین مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی کی درس گاہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہ زمانہ خود مولانا حیدر آبادی کے ضعف اور ترکِ تدریس کا تھا، لیکن مولانا محمد عبدالشکور

لکھنوی نے اپنی محنت، اخلاص اور لگن سے جلد ہی استاذ مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔ آٹھ سال مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی کی خدمت میں رہ کر ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں فراغت حاصل کی۔ درسی تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا لکھنوی مختلف مدارس میں تدریس اور مختلف اداروں اور مطابع سے وابستہ رہ کر خدمات انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء میں شیعہ خطیب اور مناظر مولانا مقبول احمد دہلوی (۱۲۸۷ھ-۱۳۳۹ھ/۱۸۷۰ء-۱۹۲۱ء) کے لکھنؤ ورود، تسنن اور تشیع کے حساس ترین موضوعات پر شعلہ بیان خطابت، مجالس اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شیعہ سنی منافرت کے ازالے کے لیے مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی کے حکم پر مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی ایک بار پھر لکھنؤ واپس تشریف لائے۔ لکھنؤ کے مخصوص مذہبی ماحول کے باعث مولانا لکھنوی یہاں مستقلاً قیام کے حق میں نہیں تھے۔ ۱۷صفر ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء کو لکھے گئے ایک خط میں مولانا لکھنوی اپنے استاذ مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لکھنؤ میں میرا قیام آپ کی ذات سے تھا، ورنہ اس شہر سے مجھے طبعی نفرت ہے۔"[۸]

بہر کیف لکھنؤ واپسی کے بعد فی الاصل مولانا لکھنوی کی عملی میدان میں دینی و تحریکی خدمات، اور تجدیدی مساعی کا آغاز ہوا۔ آپ نے ورودِ ثانی پر یہاں دینی اُمور کی مختلف جہات: تدریس، تحقیق، تصنیف، صحافت، وعظ و ارشاد، سلوک و عرفان، اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل میں قابل ذکر کام کیا، بالخصوص عظمت و ناموسِ صحابہؓ کے تحفظ میں عوامی و ادارتی ہر سطح پر، خواہ تحریر ہو یا تقریر، تحریکات ہوں یا مناظرے، آپ کی زندگی وقف رہی۔ اس باب میں "دار المبلغین" کا قیام[۹] اور روافض کی "تبرا ایجی ٹیشن"[۱۰] کے انسداد کے لیے کوششوں اور "تحریکِ مدحِ صحابہؓ"[۱۱] نے ایسی عالم گیر شہرت اختیار کی کہ بالآخر حکومت کو اہلِ سنت کا یہ حق تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمان جب اور جہاں چاہیں صحابہ کرامؓ کی مدح، فضائل اور مناقب بیان کر سکتے ہیں اور اس کا انھیں ہر طرح کا دینی استناد، قانونی حق اور اخلاقی جواز حاصل ہے۔ مدحِ صحابہؓ کی تحریک نے جس طرح ملک گیر شہرت اختیار کی، حکومت کی جانب داریوں سے مجبور ہو کر مولانا لکھنوی کے ایما پر ملک میں سول نافرمانی کا آغاز ہوا اور اس حساس اور سنگین ترین مسئلے نے ملک بھر کے جید علما کو اس مسئلے میں مدحِ صحابہؓ کی مشروعیت اور اس کے جواز کے حق میں آواز بلند کرنے پر متوجہ کیا۔[۱۲] اس سلسلے میں مولانا لکھنوی کو جیل بھی جانا پڑا۔[۱۳]

اتنی ہنگامی، تحریکی، پے بہ پے اسفار سے مصروف زندگی کے باوجود مولانا لکھنوی نے تصانیف کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ تحقیق اور اُسلوبِ نگارش کے اعتبار سے آپ کی ہر تصنیف اعلیٰ معیار کی حامل ہے۔ تصانیف کے موضوعات متنوع ہیں۔ عظمت صحابہؓ کا بیان اور مخالفین صحابہؓ کا رد تو آپ کا اختصاصی موضوع تھا، ان کے علاوہ تفسیر، حدیث، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سیرتِ خلفائے راشدینؓ، مناقب و تعلیماتِ اہل بیتؓ، عقائد، کلام، فقہ، تصوف، متقدمین کی کئی کئی مجلدات پر مشتمل کتابوں کے تراجم، ان پر قیمتی حواشی اور مختلف ادیان و فرق سے ہونے والے مناظروں کی رودادوں پر مشتمل ہیں۔ آپ کی اکثر تصانیف آپ کی زندگی ہی میں طبع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں اور اس وقت سے تاحال ان کے کئی کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکلتے رہے ہیں۔[۱۴] اس کے باوجود کئی اہم کتابیں اور مضامین اب تک منتظرِ طباعت ہیں، ان اہم کتابوں میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ (۷۹ھ-۱۵۰ھ/۶۹۹ء-۷۶۷ء) کی کتاب ’’فقہ اکبر‘‘ کا ترجمہ و حواشی[۱۵] اور النجم میں ۳۰-۳۵ قسطوں میں شائع ہونے والے مضمون ’’عقلِ سلیم اور صراطِ مستقیم‘‘[۱۶] جیسے وقیع موضوعات شامل ہیں۔

مولانا عبدالشکور لکھنوی کی مختلف الجہات خدمات کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ کی شخصیت اور افادات پر اکادمیاتی طرز کے کئی معیاری کام پیش کیے جاتے اور ان علوم اور تحقیقات کے دائرے کی حفاظت اور توسیع کی جاتی، لیکن مولانا لکھنوی کے انتقال کے قریب چار عشرے گزرنے تک اس سلسلے میں دینی جرائد کی ایک دو خصوصی اشاعتوں[۱۷] اور چند مضامین[۱۸] کے استثنا کے ساتھ، کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس عرصے میں مولانا لکھنوی کو دیکھنے اور ان سے براہِ راست استفادہ کرنے والوں میں سے اکثر اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے، حالاں کہ ان ہی کے مشاہدات، تاثرات اور بیانات سے مولانا لکھنوی کی سوانح کے کئی پوشیدہ، مگر قابلِ ذکر، پہلو معرضِ بیان میں آ سکتے تھے، حاضر باش افراد کے گزر جانے کے بعد ان کا کوئی متبادل یا نعم البدل نہیں تھا، یہاں تک کہ مولانا لکھنوی کے انتقال کے اڑتیس سال بعد مولانا لکھنوی کی سوانح اور خدمات کے باب میں جو کام منظر عام پر آیا، وہ اپنے معیار اور صحتِ تحقیق کے اعتبار سے نہایت وقیع ثابت ہوا۔ یہ کام مولانا عبدالشکور لکھنوی کے حفید پروفیسر محمد عبدالحئ فاروقی (۱۳۵۵ھ-۱۴۳۵ھ/۱۹۳۶ء-۲۰۱۴ء) کی تصنیف فرمودہ ضخیم کتاب ’’امامِ اہلِ سنت حضرت علامہ محمد عبدالشکور لکھنوی: حیات و خدمات‘‘ (لاہور: ادارہ تحقیقاتِ اہلِ سنت، ۲۰۰۹ء) کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتاب

میں مولانا لکھنوی کی شخصیت اور سوانح کی غیر معمولی تاخیر اور معلومات کے فقدان کا نہایت عمدہ طریقے سے ازالہ کیا گیا اور اس کتاب نے مولانا لکھنوی کے معتقدین کے شکوں کو راحت میں بدل دیا۔

مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ پروفیسر محمد عبدالحیٔ فاروقی کی ایک اور اہم کاوش مولانا لکھنوی کے خطوط بہ عنوان "مکتوباتِ امامِ اہلِ سنت" (لاہور: دارالکتاب، ۲۰۱۹ء) کی تدوین و ترتیب اور اس پر حواشی و تعلیقات کا اہتمام بھی ہے۔ اکابر علما و صلحا کی سوانح اور ملفوظات وافادات کی تدوین کے ساتھ ان کے مکتوبات کی اشاعت دینی روایت کا قابلِ ستائش حصہ رہی ہے۔[۹۱]

مولانا لکھنوی باصفا اور علم و عمل کی یکجائی کی منتہائی شان کے حامل عالم، صوفی اور مجاہد تھے۔ "مکتوبات امام اہل سنت" کے مطالعے سے ان کی ذاتی زندگی، دینی سیادت، علمی لگن، انہماک، سلوک و عرفان کی شناوری، خلقِ خدا کی غم گساری، مجاہدانہ سرگرمیوں، مناظرانہ احوال اور دینی، ملی، ملکی اور سیاسی معاملات پر ان کی گہری نظر اور بالغ شعور، دین اور حفاظتِ دین کے لیے قید و بند کی صعوبتوں اور نوع بہ نوع مصائب و آلام کے وقوع کا پتا چلتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان مکتوبات میں مولانا لکھنوی کی تمام علمی اور احوالی حیثیتیں مجتمع ہو گئی ہیں۔ ان خطوط کے آئینے میں مولانا لکھنوی متضاد اوصاف کے حامل ایک ایسے عالمِ ربانی نظر آتے ہیں، جن کی ذات میں علم و عشق اور جدل و معرفت ایسے متضاد اوصاف اپنی پوری منتہائی شان کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

ان خطوط کے مطالعے سے جہاں مولانا لکھنوی کے عقائد، نظریات، مسلک و مشرب، ذاتی، گھریلو اور خاندانی احوال، حالات کی تنگیوں اور آزمائشوں سے بھرپور زندگی، ہمہ وقت اور ہر طرح کے حالات میں راضی بہ رضا رہنے، تعلق مع اللہ، ذوقِ عبادت خصوصاً نماز سے شغف اور تعلق اور شوقِ شہادت سے متعلق وافر معلومات ملتی ہیں، وہیں مطالعے کی وسعت، ناقدانہ بصیرت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدس سے عشق، صحابہ کرامؓ کے دفاع اور ناقدین و مارقینِ صحابہؓ کی گوشمالی میں بھی وہ یکتا نظر آتے ہیں۔

مولانا لکھنوی نے ان خطوط میں بعض معاصر اصحابِ علم کو بھی مخاطب بنایا ہے، مرعوبیت کے بغیر اُن کے مطلوبہ ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے اور اختلاف کے حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنا مؤقف نہایت مضبوط علمی اسلوب اور تحقیقی انداز میں پیش فرمایا ہے۔ بعض مکاتیب کے مخاطب مکتبِ تشیع سے وابستہ یا مسیحی افراد رہے ہیں، ان کے شبہات یا اعتراضات کا ازالہ جس تحقیق اور شفقت کے ساتھ کیا گیا ہے وہ

اسلامی تہذیب کی مناظرانہ روایت کا نہایت درخشاں باب رہا ہے، جس کے احیا کی ضرورت اس زمانے میں سب سے زیادہ ہے۔ مولانا لکھنوی ایک جید عالم، محقق مصنف، مقبول واعظ، مسلّم مناظر، صحافی اور حکیم ہونے کے ساتھ ایک صاحبِ نسبت وارشاد صوفی بھی تھے، لوگوں کی معتد بہ تعداد آپ سے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں بیعت ہوئی تھی۔ ان خطوط میں مولانا لکھنوی کی اپنے مسترشدین کی عرفانی تربیت کے نمونے بھی بہت وضاحت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ الغرض ان خطوط کی روشنی میں مولانا لکھنوی مرحوم کی ایک مختصر لیکن وقیع اور جامع ''خودنوشت سوانح'' مرتب کی جاسکتی ہے۔

''مکتوباتِ امامِ اہلِ سنت'' مولانا لکھنوی کے مکتوبات کا پہلا، مرتب اور منضبط مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں یوں تو مولانا لکھنوی کے تحریر فرمودہ سینکڑوں خطوط کا ذخیرہ محفوظ ہو گیا ہے، لیکن مولانا لکھنوی کی خطوط کے معاملے میں زود نویسی کے پیشِ نظر یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ابھی اس مجموعے سے دوگنا زیادہ خطوط تلاش کے منتظر اور تدوین کے متقاضی ہوں گے، جنھیں رسائل و جرائد کی گرد میں اَٹی فائلوں اور ان کے مختلف معتقدین کے اخلاف کے پاس سے انھیں حاصل کر کے شائع کرنا، مولانا لکھنوی کے نیاز مندوں یا اُنھیں موضوعِ تحقیق بنانے والوں کا کام ہے۔ ''مکتوباتِ امامِ اہلِ سنت'' کے دیباچے میں مرتب نے بھی لکھا ہے:

''اس ذخیرے میں صرف ان ہی مکاتیب کو شامل کیا گیا ہے، جن کی کوئی تاریخی حیثیت ہے یا جن میں کچھ مخصوص نظریات وخیالات پر بحث کی گئی ہے۔''

اس مطبوعہ مجموعے سے قبل مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کے خطوط کی جمع وتدوین کی جو اِکادُکا کوششیں ہوئی ہیں، مضمون نگار کی معلومات کی حد تک اس کی تفصیلات یہ ہیں:

(ا) مولانا لکھنوی اپنے بعض اہم خطوط، جن کا تعلق کسی دینی معاملے، کسی اعلان یا تعزیتوں سے متعلق ہوتا، اپنے اخبار ''النجم'' میں شائع فرماتے رہے۔ ''النجم'' میں شائع ہونے والے کئی اہم خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں۔

(۲) پاکستان کے ممتاز محقق ڈاکٹر محمد ایوب قادری (۱۳۴۴ھ-۱۴۰۳ھ/۱۹۲۶ء-۱۹۸۳ء) نے مولانا لکھنوی کے سات خطوط اپنے تعلیقات وحواشی کے ساتھ مرتب کیے تھے۔[۲۰]

(۳) ہندستان کے مشہور صاحبِ قلم مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہوی (۱۳۷۰ھ-۱۴۳۴ھ/۱۹۵۱ء-۲۰۱۳ء) نے مولانا لکھنوی کے چار خطوط بہ عنوان ''امامِ اہلِ سنت کے چار مکتوب'' ۱۹۷۹ء میں شائع کیے تھے۔

(۴) علمائے بگویہ کے حالات میں صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی کی مرتب کردہ چار ضخیم مجلدات پر محیط کتاب کی تیسری جلد، جو مکاتیب ہی پر مشتمل ہے، میں مولانا لکھنوی کے تین خطوط شامل ہیں۔[۲۱]

(۵) پروفیسر محمد عبدالحیٔ فاروقی کی تالیف کردہ مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کی سوانح میں دو اقتباسات کے ذریعے مولانا لکھنوی کے دو مزید خطوط کا پتا ملتا ہے، جو مکتوبات کے مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے۔ ایک خط مولانا لکھنوی نے اپنے استاذ مولانا عین القضاۃ حیدرآبادی کے نام لکھا تھا (اس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے) اور دوسرے مکتوب کا ایک طویل اقتباس موجود ہے، لیکن مکتوب الیہ کا نام درج نہیں۔[۲۲]

بہر کیف یہ مجموعہ مکاتیب ہر لحاظ سے ایک وقیع اور اہم کاوش ہے۔ اس مجموعے میں شائع شدہ خطوط کی کل تعداد (۲۶۲) ہے، جب کہ بعض خطوط مجموعے کی ترتیب وتدوین کے بعد حروف چینی کے وقت مضمون نگار کو دریافت ہوئے، جنھیں اسی مجموعے میں بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

ذیل میں مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کے ان خطوط کا ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے:

[۱] ذاتی عقائد

مولانا لکھنوی کی پوری زندگی عقیدے، مسلک اور نظریے کی حفاظت سے عبارت ہے۔ اگر مولانا لکھنوی کی حیات اور خدمات کا حاصل پیش کیا جائے تو اسے ''تطہیرِ عقائد'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مولانا لکھنوی ظاہر ہے کہ اہل سنت وجماعت کی مسلسل دینی روایت کے امین اور علمی منہج کے داعی ومناد تھے۔ مشکل یہ ہے کہ برِ عظیم میں خود کو اہل سنت وجماعت سے منسوب کرنے والے کئی مکاتبِ فکر اور حلقۂ علوم موجود رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ مولانا لکھنوی ان میں سے کس مکتب ومسلک کے ترجمان تھے، اپنے ایک خط میں انھوں نے اپنے عقیدے اور مذہب کا اظہار بہت ہی جامع انداز میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

''میرے جو بھی عقائد ہیں ان میں ذرا بھی تلوّن اور تغیّر نہیں ہے اور یہ وہی عقائد ہیں جو بقیۃ السلف الصالحین، مذکرۃ الاولیاء والکاملین، عالم الاسلام، الامام المقدام مولانا سید محمد عبدالسلام احلہ اللہ دار السلام نقشبندی مجددی نے میرے والد مرحوم کو تعلیم فرمائے، اور پھر والد مرحوم نے مجھے بچپن میں سکھائے تھے، پھر جناب مرحوم ہی نے حضرت امام ربانی کے اکثر مکاتیب سنائے اور ان میں سے بعض بعض عبارتیں یاد کرائیں، جن میں سے کچھ اب تک یاد بھی ہیں، پھر میرے استاذ جن سے میں نے فقہ، نورالانوار اور تفسیر جلالین وغیرہ پڑھی تھیں، وہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، ان کے بھی میں نے وہی عقائد پائے، پھر جب لکھنؤ حاضر ہوا اور توفیقِ الٰہی نے استاذ الوقت حضرت مولانا سید عین القضاۃ کے آستانہ فیض کاشانہ پر پہنچایا تو انھیں بھی ان ہی عقائد کا معتقد پایا اور وہ بھی مولانا رشید احمد صاحب اور علمائے دیوبند کے معترف و مداح تھے، اور پھر جب کریم وہاب نے میری آنکھ میں کچھ بینائی عطا فرمائی تو میں نے اپنے عقائد کو خوب جانچا اور بحمد للہ تعالیٰ انھیں مطابق شریعت طاہرہ کے پایا۔ میں اولیاء اللہ کا منکر نہیں ہوں، اولیاء اللہ تو ایک مفہوم عام ہے، میں جمیع طوائف اہلِ حق کو علیٰ تفاوتِ منازل لائقِ صد احترام سمجھتا ہوں۔ نہ صرف فقہاء، محدثین و مفسرین بلکہ میں تو حضرات صوفیہ کا بھی منکر نہیں ہوں، انھیں خلاصہ کائنات سمجھتا ہوں، خاص کر ساداتِ نقشبندیہ کو مولانا جامی علیہ الرحمہ کے اس شعر کا بہترین مصداق جانتا ہوں۔

بے عنایاتِ حق وخاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

اور ان میں بھی حضرت امام ربانی اور ان کے متبعین صادقین کو بہترین نمونہ یقین کرتا ہوں۔''[۲۳]

[۲] نماز کے ساتھ شغف اور تعلق

ایمان اور عقیدے کی صحت کے بعد اسلام میں سب سے زیادہ تاکید ''نماز'' کے متعلق ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کو اسلام اور کفر کے مابین ''حد فاصل'' قرار دیا ہے۔ مولانا عبدالشکور لکھنوی نے ''النجم'' میں اپنے احباب اور متوسلین کے نام نماز کی حقیقت، اہمیت، فضائل اور اسے بہتر سے بہتر بنانے سے متعلق مفصل اور مستقل سلسلہ مکتوبات شروع فرمایا تھا۔ سال میں ایک مرتبہ نماز سے متعلق بہ صورت مکتوب ایک مضمون شائع ہوتا، یہ سلسلہ تین سال جاری رہا۔ نماز سے متعلق ان

خطوط میں قرآنی آیات کے استناد کے ساتھ نماز کی فرضیت، اہمیت، تاکید اور افادیت پر مفصل بحث کی جاتی تھی۔

اس سلسلے کا پہلا خط جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۳ء کا لکھا ہوا ہے، اس کی ابتدا اِن سطور سے ہوتی ہے:

''اس وقت جو پیغام سنانا چاہتا ہوں، یہ میرے نفس کا پیغام نہیں، بلکہ یہ وہ پیغام ہے جو سات آسمانوں کے اوپر سے نازل ہوا ہے، یعنی یہ قرآن مجید کی چند آیتیں ہیں جن پر مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کا بہت کچھ انحصار ہے۔''[۲۴]

اس خط میں قرآن مجید کی چھبیس آیاتِ مبارکہ کے ترجمے کو مختلف جلی عنوانات کے تحت ایک خاص ترتیب سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ کسی تفسیر و تشریح کی حاجت ہی نہ رہے اور نماز کی اہمیت، فرضیت اور تاکید براہ راست اللہ تعالیٰ کے فرمان سے واضح ہو جائے۔ البتہ کہیں کہیں بعض آیات کے ضمن میں ایک دو جملے بہ طور ''فائدہ'' لکھے گئے ہیں۔ خط کے اختتام پر آئندہ خط کے اجرا کو قارئین کی طلب اور دل چسپی سے مشروط کرتے ہوئے مولانا لکھنوی لکھتے ہیں:

''اس کے بعد اگر لوگوں کی طرف سے طلبِ صادق اور شوقِ کامل کا ظہور ہوا تو، ان شاءاللہ تعالیٰ! کسی دوسرے خط میں اچھی نماز پڑھنے کا وہ طریقہ اور تدبیر کہوں گا جو خداوند کریم جل شانہٗ نے اپنی کتابِ مبارک سے اس ناچیز پر منکشف فرمایا ہے۔ یہ اس مالک کا انعام ہے، جس کا شکر یہ اگر ہر موئے بدن زبان ہو جائے تو بھی ادا نہیں ہو سکتا۔''[۲۵]

نماز سے متعلق دوسرا خط جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء کو لکھا گیا، چونکہ گزشتہ خط بھی نماز ہی سے متعلق تھا، اس لیے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ اس خط میں بھی سابقہ بیان کردہ احکام اور تاکیدات ہی کو الفاظ بدل کر دوبارہ لکھ دیا گیا ہوگا۔ مولانا لکھنوی اس غلط فہمی کا اِزالہ کرتے ہوئے شروع ہی میں لکھتے ہیں:

''یہ خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین مشترک نہ ہونے پائیں۔ تمام احباب سے التجا ہے کہ گزشتہ خط کے ساتھ اس خط کو بھی منظم کر لیں''۔[۲۶]

اس خط میں قرآن حکیم کی مزید اُنیس آیاتِ مبارکہ سے نماز کا شرائعِ الٰہیہ کا مقصود اصلی ہونا، قبر میں سب سے پہلا سوال نماز کے متعلق ہونا اور ترکِ نماز پر قرآن مجید میں بیان کردہ وعیدوں سے اعتنا کیا گیا ہے۔ اس خط میں انھوں نے قرآنی آیات پر جا بہ جا عمدہ اور نادر تشریحی نوٹ بھی تحریر کیے ہیں۔ سورۃ

التوبۃ: ۴۵ کی تشریح کے ضمن میں ایک ایسے مغالطے کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے، جسے آج بھی مختلف عنوانات سے بڑے شد و مد کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کچھ لوگ نیک کاموں میں اپنی دولت خرچ کرتے ہیں، مگر ان کا خرچ خدا کے یہاں قبول نہیں ہوتا، ان پر پوری طرح یہ مثل صادق آتی ہے کہ نیکی برباد گناہ لازم۔ اس وبال کے تین سبب اس آیت میں ارشاد فرمائے گئے ہیں: اول کافر ہونا، دوم نماز میں سستی کرنا اور سوم بغیر دلی رغبت کے خرچ کرنا۔ اس طرح اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ نماز میں سستی کرنا ہے، دوسرے یہ کہ نماز میں جو شخص سستی کرتا ہے اس کی کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی۔"[۲۷]

اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

"نماز کے متعلق اس وقت انیس آیات لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد دل چاہتا تھا کہ کچھ احادیث بھی لکھوں اور صحابہ کرامؓ کے کچھ واقعات بھی لکھوں، جس سے معلوم ہو کہ وہ حضرات کیسا اہتمام نماز کے لیے کرتے تھے؟ مگر اب سرِ دست اپنی اس خواہش کو بہ خیالِ طول مؤخر کرتا ہوں۔ ان شاءاللہ تعالیٰ تیسری جلد کے شروع میں اچھی نماز پڑھنے کا طریقہ اور نماز میں حسن و جمال پیدا کرنے کی تدبیر قرآن کریم کی آیاتِ مبارکہ سے اخذ کر کے لکھوں گا اور اس کے ساتھ کچھ احادیث و آثار بھی مذکور ہوں گے، وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔"[۲۸]

تیسرا خط جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ خط کی تمہید میں مضمون کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھنوی لکھتے ہیں:

"پیش تر کے دونوں خطوط میں وعدہ تھا کہ ان شاءاللہ! اچھی نماز پڑھنے کا طریقہ قرآن کریم سے ہدیۂ احباب کیا جائے گا، لہٰذا اس وقت اس وعدے کے پورا کرنے کا ارادہ ہے۔ اگرچہ یہ مضمون میرے حوصلے سے بالاتر ہے، اس لیے بار بار ارادہ کرنے پر بھی ہمت نہیں ہوتی، ہاں! مگر لطفِ خدا پیش نہد گامے چند ......خط میں دو چیزیں بیان کرنے کی ہیں، اول نماز کی حقیقت کہ جس سے معلوم ہو کہ اچھی نماز کس کو کہتے ہیں؟ دوم اس حقیقت کے حاصل کرنے کا طریقہ، جس سے معلوم ہو کہ اچھی نماز پڑھنے کی تدبیر یہ ہے۔"[۲۹]

اس خط میں مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی نے نماز سے متعلق چھ مزید آیات پیش فرمائی ہیں، اور ان کی تشریح میں نہایت بلند عارفانہ اور باطنی و روحانی نکات بیان فرمائے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''عربی لغت میں لفظ ''صلوۃ'' بہ معنی دعا ہے اور اصل لغت میں اس لفظ کے معنی سرین ہلانے کے ہیں۔ سرین ہلانا بے چینی اور بے قراری سے کنایہ ہے۔ اس خاص عبادت کو ''صلوۃ'' کہنا صاف بتلا رہا ہے کہ اس عبادت کی اصل حقیقت بے چینی و بے قراری ہے۔ نماز کی صورت و شکل بھی یہ ظاہر کر رہی ہے کہ بندہ اپنے مالک کے سامنے اپنی عاجزی و نیاز مندی کی نذر پیش کر رہا ہے اور اس وقت اس کی حالت ایک مرغ بسمل کی سی ہے، کبھی ہاتھ باندھے کھڑا ہے، کبھی جھک گیا ہے، پھر کھڑا ہو گیا، پھر پیشانی کے بل زمین پر گر گیا، پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا، پھر گر گیا، غرض یہ کہ کسی حالت پر بھی اس کو چین و قرار نہیں۔''[۳۰]

[۳] آزمائشوں اور مصائب پر صبر واستقامت

مولانا لکھنوی کی بھرپور علمی، تحریکی اور مناظرانہ کاوشوں اور اسفار کی کثرت کے باعث ایسا لگتا ہے کہ ان کی پوری زندگی نہایت آسودگی اور اطمینان سے عبارت ہو گی، لیکن ان کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مسلسل آزمائشوں اور پریشانیوں سے گراں بار رہے ہیں۔ انسان خود پر آنے والی تکالیف کو تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر ہی لیتا ہے، لیکن اپنی اولادوں اور اقارب کے ذریعے سے ملنے والی تکالیف اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ احباب و متعلقین کے نام اکثر خطوط میں کسی صاحبزادے، صاحبزادی یا کسی قریبی عزیز کی علالت یا انتقال کی خبر ملتی ہے۔ حافظ عبدالعزیز کی علالت،[۳۱] جو بالآخر ان کی وفات پر منتج ہوئی،[۳۲] مولانا حکیم عبدالغنی فاروقی کی بڑھی ہوئی علالت،[۳۳] اپنی بہو کی شدید علالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نور چشم مولوی حافظ عبدالعزیز سلمہ کے گھر میں علالت بدستور ہے۔ لکھنؤ میں کوئی بڑا ڈاکٹر باقی نہیں جس کا علاج نہ ہوا ہو۔''[۳۴]

جب بہو کی حالت ذرا سنبھلی تو:

''نور چشمان مولوی محمد عبدالمؤمن و عبدالمہیمن کو شدید بخار میں مبتلا پایا۔''[۳۵]

مزید:

''خود میں بیمار رہا، تپ و لرزہ شدید آیا، پھر نور چشم مولوی عبدالغفور بیمار ہیں اور اب عبدالمہیمن کی علالت ہے۔''[۳۶]

نیز:

''کل امروہہ سے نور چشم مولوی حافظ محمد عبدالاول کی سخت علالت کی خبر آئی، جس سے بہت تشویش ہوگئی۔''[۳۷]

اور پھر صرف علالت ہی نہیں بلکہ انتہائی چہیتی اور اکلوتی بیٹی جناب ماریۃ الزہراء (۱۳۳۴ھ - ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۱۵ء - ۱۹۳۶ء) کا صرف اکیس سال کی عمر میں انتقال کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ مولانا ان کے انتقال پر اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۴ر رمضان المبارک کو میں نے اپنی لڑکی کو، جو سب اولاد میں محبوب تر تھی، رحمتِ الٰہی کے سپرد کیا۔ دس ماہ ہوئے اس کا نکاح کیا تھا۔ بچہ پیدا ہونے کے سلسلے میں بیماری اور بیماری کا انجام موت ہوا۔''[۳۸]

اپنے کم سن صاحبزادے کے انتقال پر اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب سب سے پہلے لڑکے میاں عبدالرؤف کا انتقال ہوا، جس کی عمر پانچ سال کے قریب تھی، تو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس صدمے کی کیفیت کا اندازہ بھی اب میں نہیں کر سکتا۔''[۳۹]

اپنی رفیقہ حیات اور پارسا زوجہ کی جدائی کا صدمہ بھی مولانا لکھنوی نے سہا، جن کا نثری مرثیہ بھی ان کے غم آگیں قلم سے اسی مجموعے میں شامل ہے۔[۴۰] پھر چھوٹی پوتی کا بہ عارضہ چیچک انتقال،[۴۱] الغرض مولانا لکھنوی کی پوری زندگی اہلِ خانہ اور قریبی عزیزوں کی علالتوں اور انتقال کے صدمات سے مسلسل دوچار رہی ہے۔ اس نوعیت کے ایک آدھ صدمات ہی سے آدمی کو سنبھلنے میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے، چہ جائیکہ ان کا تسلسل۔ مزید حیرت کا موجب یہ امر ہے کہ ان تمام ذہنی پریشانیوں اور صدمات کے باوصف مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی اپنے معمولات اور علمی، اصلاحی، تصنیفی و تحریکی سرگرمیوں میں ایک آسودہ حال اور پریشانیوں سے محفوظ شخص سے زیادہ مستعد نظر آتے ہیں۔ ایک خط میں خود پر آنے والے مصائب اور مصائب کے نزول کی وجوہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس فقیر کے حوادث پر نظر ڈالیے تو شاید باعث تسکین ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان حوادث کو دنیا میں اس لیے رکھا ہے کہ دنیا سے دل برداشتہ ہو۔''[۴۲]

اور ان حالات پر ایک بندہ مومن کو کس طرح صبر پر قانع اور راضی بہ رضا رہنا چاہیے، مولانا لکھتے ہیں:

''حالات غم میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں مخفی ہوتی ہیں۔ ہم بندے کا کام صبر کرنا اور رضائے الٰہی پر ہر حال میں خوش رہنا ہے۔''[۴۳]

[۴] کام کی دھن اور لگن

نصرتِ اہلِ سنت اور مدحِ صحابہؓ مولانا لکھنوی کی زندگی کا جلی عنوان ہے۔ مولانا ان اعتقادات اور مسائل میں اہل سنت و جماعت کے عقائد و افکار سے متخالف نقطہ نظر رکھنے، لکھنے اور بولنے والوں پر بڑی بیدار نظر رکھتے تھے۔ اس باب میں ان کا طریق نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کتاب کے جواب میں کتاب، تقریر کے جواب میں تقریر، مناظرے کے جواب میں مناظرہ، مشاعرے کے جواب میں مشاعرہ اور تحریک کے جواب میں تحریک، غرض جس سطح کی کارروائی ہو اسی سطح کا جواب پیش کرنے کا تھا۔ مولانا خود تو لکھتے ہی تھے، اپنے سے وابستہ دیگر اصحابِ علم کو بھی وقتاً فوقتاً ترغیب دیا کرتے تھے، کبھی کبھی مولانا کی یہ ترغیبات بادی النظر میں ''ضد'' محسوس ہونے لگتی تھیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا پر اپنے کام کی دھن اور مشن کا جذبہ اس قدر حاوی تھا کہ وہ اس کے لیے بالکل بے نفس ہو گئے تھے، بالفاظ دیگر اپنے کام کی لگن کے روبہ رو ان کی ذات بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی کو بعض رسائل کی تکمیل کے لیے مولانا لکھنوی کافی عرصے سے بہ ذریعہ خطوط متوجہ فرمارہے تھے۔ مولانا اعظمی کی طرف سے تاخیر پر جب معذرت کی درخواست پیش کی گئی تو مولانا لکھنوی نے ان کے نام خط میں لکھا:

''معاف کرنے کے متعلق لکھ کر آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں، میں ایسا کب ہوں کہ آپ سے ناراض ہو سکتا ہوں اور آپ اس ناراضی کو کچھ اہمیت دیں۔''[۴۴]

[۵] معمولات کی پابندی

اوقات اور معمولات کی پابندی علما و صوفیہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس پابندی کے باعث بڑے بڑے مہمات مسائل اور ضخیم مجلدات پر مشتمل متنوع تصنیفی و تالیفی کام، جو پورے پورے اداروں اور اکادمیوں کے کرنے کے ہوتے ہیں، برعظیم کی دینی تاریخ میں، فردِ واحد نے دیگر مصروفیات کے ساتھ، بہ خوبی انجام دیے ہیں۔ مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کی انتہائی مصروف زندگی کے ساتھ جب ان کی تصانیف، تراجم، رسالے اور پھر اخبار کی ادارت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک فرد نے پے بہ پے اسفار، مناظروں اور تحریکوں کے باوصف تصنیف و تراجم کا اتنا بڑا دفتر کیسے تیار کر لیا؟ اس کی جو توجیہہ مولانا کے حالات زندگی اور مکتوبات کے مطالعے سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ مولانا ایک ذمے دار عالم اور باعمل نقش بندی صوفی تھے۔ صوفیہ کے یہاں اوقات کی رعایت اور معمولات کی پابندی ''ضروریات'' میں داخل سمجھی

جاتی ہے، اس لیے مولانا لکھنوی کی زندگی میں اس پابندی کا پورا پورا اہتمام تھا۔ وہ خود تو معمولات کے حد درجے پابند تھے ہی، اپنے متعلقین اور مسترشدین کو بھی اسی کی تلقین فرماتے تھے، ایک خط میں نصیحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنے شبانہ روز کے اوقات کی تقسیم اور اس تقسیم کی سختی سے پابندی ضروری ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

صوفی ابن الوقت آمدے اے پسر!

اور حضرت امام ربانی فرماتے ہیں کہ یہ ادنیٰ درجہ ہی اعلیٰ درجہ ہے کہ: ''الصوفی أبوالوقت''۔''[۴۵]

ایک مکتوب میں اوقات کی پابندی نہ کرنے اور آج کے کام کو کل پر مؤخر کرنے والوں پر وعید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حدیث شریف میں ہے: ہلک المسوفون، حضرت امام ربانی اس کا ترجمہ مکتوباتِ قدسیہ میں لکھتے ہیں: ہلاک شدند سوف أفعل گویندگان۔ ''سوف أفعل'' کے معنی ''عنقریب اس کام کو کرلوں گا'' کے ہیں۔''[۴۶]

[۶] مجادلہ حسنہ کا اظہار

قرآن مجید نے مخصوص قیود و حدود اور شرائط کے ساتھ ''مجادلہ حسنہ'' کو داعی کی صفات میں سے ایک صفت قرار دیا ہے۔ دین حق اور اس کی تشریح و تعبیر کو جس طرح حکمت و موعظت کے ساتھ پیش کیا جانا ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح دلائل و براہین اور حجت و استدلال کی راہ سے دین اور دینی عقائد پر اٹھائے جانے والے اعتراضات اور درپیش شبہات کا جواب دینا بھی دین کا ایک اہم فریضہ ہے:

''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ۔'' [۱۶:۱۲۵]

''(اے پیغمبر!) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے رب کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو، جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا رب اُسے بھی خوب جانتا ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں اُن سے بھی خوب واقف ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''جاہدوا المشرکین بأیدیکم و ألسنتکم و أموالکم۔''[۴۷]

''مشرکین سے اپنے ہاتھوں، اپنی زبانوں اور اپنے مالوں سے جہاد کرو۔''

کتاب و سنت کی ان ہی تاکیدات کے باعث امت مسلمہ کے ہر عہد میں متکلمین و مناظرین کی ایک جماعت مستقل طور پر یہی فریضہ انجام دیتی رہی ہے۔ مکتبِ تشیع سے وابستہ ایک فرد نے مولانا لکھنوی سے یہ چبھتا ہوا سوال کیا کہ:

''مذہبی بحث ایک لچر چیز ہے اور سنا ہے آپ کو اس سے بہت دل چسپی ہے، مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی ماہر علم و فن اس میں شوق سے حصہ لیتا ہو؟''

مولانا لکھنوی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''معروض ہے کہ مذہبی بحث سے اگر اس کے اصلی اور صحیح معنی مراد ہیں، یعنی حق کی حقیت اور باطل کے بطلان کا بہ طریقِ موعظتِ حسنہ ظاہر کرنا، تو بے شک مجھے اس میں دل چسپی ہے، یعنی میں اس کو ایک بڑی عمدہ خدمت دینِ متین کی سمجھتا ہوں، خصوصاً جب کہ دینِ حق پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور اہلِ باطل خواہ مخواہ اہل حق کو بہکانے اور فریب دینے میں اپنی پوری طاقت خرچ کر رہے ہوں۔ میں مذہبی بحث کو بہ معنی مذکور فرضِ کفایہ جانتا ہوں اور میرا ناقص خیال یہ ہے کہ ہر زمانے کے علما و صلحا نے اس خدمت کو اپنے اپنے حوصلے کے موافق انجام دیا ہے اور تمام انبیائے کرام علی نبینا علیہم السلام اس مذہبی بحث کے لیے دنیا میں تشریف لائے اور تمام عمر یہی کام کرتے رہے۔ قرآن عظیم میں اسی بحث کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زریں الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا حکم ایک بڑے پیمانے پر دیا گیا ہے اور احادیث کریمہ میں اس مذہبی بحث کے بڑے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں اور اس مذہبی بحث میں حصہ نہ لینے والے کو ''بے ایمان''، ''شیطان'' اور آخر میں ''گونگا شیطان'' کا بدترین لقب عنایت ہوا ہے۔ میرا خیال ہے مذہبی بحث کو بہ معنی مذکور تو کوئی مسلمان ہی کیا کوئی اہل مذہب بلکہ کوئی ذی عقل بھی غیر محمود نہیں سمجھے گا اور غالباً آپ کی مراد بھی یہ نہ ہوگی۔ اگر مذہبی بحث سے گالی گلوچ اور تو تو میں میں مراد ہے تو خدا شاہد ہے کہ میں بہ ہزار جان متنفر اور بیزار ہوں اور بے شک بہ قول آپ کے وہ ایک لچر چیز ہے۔''[۴۸]

چونکہ مولانا لکھنوی کی زندگی کا بھی ایک بڑا حصہ مختلف ادیان و فرق کے علمی نمائندوں سے مکالمے اور مناظروں میں بسر ہوا ہے، لہٰذا متذکرہ اقتباس سے مولانا لکھنوی کی مناظرانہ مساعی کا پورا پسِ

منظر اور مقصد سامنے آجاتا ہے۔ مولانا لکھنوی کے اکثر مناظروں کی رودادیں ان کی زندگی میں ہی شائع ہو کر مقبول ہوچکی تھیں۔ مجموعہ مکتوبات میں بھی کئی خطوط مسیحی اور اہلِ تشیع کے علمی نمائندوں سے مناظرانہ مکالموں پر مشتمل ہیں۔ان مراسلات میں اصولی اختلافات کی دوٹوک نشان دہی کے باوجود فریقین کا ایک دوسرے سے تخاطب اتنا شائستہ ہے کہ واقعی اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ احقاقِ حق کی علمی کوشش ہے۔اہل تشیع سے وابستہ ایک فرد کے سوالات کے مفصل جوابات تحریر فرما کر مولانا لکھنوی آخر میں لکھتے ہیں:

"معاف کیجیے گا! اگر کوئی بات خلافِ مزاج میرے قلم سے نکل گئی ہو۔ آپ کی منصفانہ طبیعت اور سلامتِ فہم نے مجھے اس تحریر کی ہمت دلائی۔"[۴۹]

مولانا لکھنوی بالعموم اپنے مخالف مخاطبین کو بھی ان کے حلقے میں مروجہ القابات کی رعایت سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

مثلاً ایک مقام پر ایک شیعہ عالم کا نام اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"مناظرۂ امروہہ میں شیعہ مناظر جناب صدرالافاضل مولوی سید سبط حسن۔"[۵۰]

ایک اور مقام پر ایک شیعہ عالم کا نام اس طرح لکھتے ہیں:

"آخر میں ان کے مجتہد اعظم مولوی سید محمد نے، جن کو شاہ اودھ نے "سلطان العلماء" کا خطاب دیا تھا۔" [۵۱]

اسی طرح مسیحی مبلغ قسیس جان قلند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "اثباتِ نبوت" پر تحریری مکالمہ جہاں مولانا لکھنوی کی مناظرانہ حذاقت اور مسلم مسیحی اختلافی اُمور پر گہری نظر پر دلالت کرتا ہے، وہیں شائستہ، سلجھی ہوئی اور باہمی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئی مراسلت بحث کی افادیت کو بڑھا دیتی ہے اور اس کے ابلاغ کے دائرے کو وسیع کر دیتی ہے۔[۵۲]

[۷] پیرانِ عظام اور سلسلۂ شیوخ سے محبت اور عقیدت

مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کے والد سید ناظر علی ایک خدارسیدہ اور فقیر منش بزرگ تھے، وہ مولانا سید شاہ عبدالسلام ہنسوی (۱۲۳۳ھ - ۱۲۹۸ھ / ۱۸۱۸ء - ۱۸۸۱ء) سے اجازت یافتہ تھے۔ مولانا لکھنوی کے استاذ مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی بھی ایک ماہر مدرس ہونے کے ساتھ ایک باصفا صوفی اور شیخ

موسیٰ جی ترکیسری (۱۲۵۴ھ-۱۳۰۹ھ/ ۱۸۳۸ء-۱۸۹۱ء) کے خلیفہ تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی صحبت نے مولانا لکھنوی کے قلب کی زمین کو سلوک و عرفان کی آبیاری کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ بالآخر سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے عالی قدر شیخ مولانا شاہ عبداللہ ابو احمد مجددی بھوپالی سے بیعت ہوئے، ان ہی سے خلافت بھی حاصل ہوئی۔[۵۳]

بزرگوں سے والہانہ تعلق اور محبت اس حد تک آپ کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھی کہ آپ اپنے ایک مرید کو دعا دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی غلامی کا طوق تمھاری گردن میں رکھے، آمین، ثم آمین، ثم آمین۔''[۵۴]

اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ جب مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کو اپنے مشائخ کے سلسلے کے اکابر سے غایت درجے محبت تھی تو اپنے شیخ و مرشد جن کے ہاتھوں میں انھوں نے اپنا ہاتھ دیا تھا، ان سے عشق و تعلق کا کیا عالم ہوگا؟! غایتِ ادب کی وجہ سے وہ اپنے شیخ کا نام نہیں لیتے تھے۔ ادب کا یہی رویہ آپ نے شیخ کی اولاد کے ساتھ بھی تازندگی روا رکھا۔ ایک مرتبہ آپ کے شیخ ایسے بیمار ہوئے کہ صحت اور زندگی سے مایوسی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس وقت مولانا لکھنوی کے گھر میں ان کے اپنے صاحبزادے مولانا عبدالمؤمن فاروقی شدید علیل تھے، لیکن شیخ کی محبت اولاد کی محبت پر غالب تھی، اس وقت کی بے چینی ایک خط سے ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس درمیان میں حضرت صاحبزادے صاحب دامت برکاتہم کی سخت علالت کی خبر نے عبدالمؤمن کی علالت کو گویا فراموش کرا دیا۔ اگرچہ تار اور خطوط میں فی الجملہ افاقے کی خبر ہے، مگر طبیعت میری بہت پریشان ہے۔ آج مشتاق علی خان کو بھوپال بھیجا ہے۔ میں خود جاتا، مگر یہاں کے جدید حالات کی وجہ سے نہ جا سکا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک سائے کو ہم خدام کے سروں پر قائم رکھے، بڑا سہارا ہے، ارحم الراحمین رحم فرمادے۔''[۵۵]

صرف شیخ ہی نہیں بلکہ پورے سلسلہ مجددیہ کے مشائخ کی محبت اور عقیدت مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کا احاطہ کیے ہوئے تھی، بالخصوص حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی محبت، ''مکتوبات امام ربانی'' کے مطالعے کی رغبت، جن کی عبارات بچپن ہی سے سنائی اور مفاہیم سمجھائے گئے، جن میں سے بقول خود ''بعض اب تک قلب پر نقش ہیں''۔ مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی مکتوباتِ امام ربانی کو اپنے درد کا مداوا سمجھتے تھے، اس کی عبارات کو اپنی کسی بات یا مؤقف کی تائید میں استناداً پیش فرماتے تھے۔ ''مکتوباتِ

امامِ ربانی'' کے علاوہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی (۱۱۵۸ھ - ۱۲۴۰ھ/ ۱۷۴۵ء - ۱۸۲۴ء) کی ایک کتاب کی جلد واپسی کا تقاضا فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اکثر اوقات میری بے چینی کو اسی سے سکون ہوتا ہے۔''[۵۶]

یہاں تک کہ ان بزرگوں کے مزارات کی زیارت کو بھی باعثِ خیر و برکت سمجھتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سفر کامیاب رہا، جاتے وقت حضرت امام ربانی اور حضرات پیرانِ طریقت کے مزارات متبرکہ کی زیارت کے لیے سرہند اُتر گیا تھا، ان ہی حضرات کی برکات سے یہ سفر اس طرح ختم ہوا۔ فللّٰہ الحمد علٰی ذلک۔''[۵۷]

[۸] سالکین کی صوفیانہ تربیت

مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی مشرباً نقشبندی مجددی تھے۔ متوسلین کی معتدبہ تعداد نے اپنے باطن کی اصلاح کے لیے ان کی طرف رجوع کیا۔ مریدین کے نام لکھے گئے خطوط سے آپ کے مربیانہ مقام اور سلوک میں رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے سلسلے یعنی نقشبندیہ کے کامل ہونے کا پورا یقین تھا۔ آپ ایک بااصول لیکن انتہائی مشفق شیخ تھے، جس کی وجہ سے مریدین کے دل میں آپ کی محبت گھر کیے ہوئے تھی، آپ کو نہ صرف اپنے مریدین کی محبت کا پورا پورا احساس تھا، بلکہ آپ اس کے نہایت قدردان بھی تھے۔ اپنے ایک مرید کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے اور حضرت شاہِ نقش بند فرما چکے ہیں: ''در طریقِ ما محرومی نیست'' (یعنی ہمارے طریقے میں محرومی کا نام نہیں)۔ بے شک آپ کے گھر میں اس حقیر اور متعلقین کے ساتھ محبت وبغایت عنایت رہی ہے اور ہے۔ اس چیز کا مجھے خوب احساس ہے۔''[۵۸]

مولانا لکھنوی اپنے مریدوں کو باقاعدہ اسباق سلوک کی تعلیم دیتے اور انھیں منازل سلوک طے کرواتے۔ مکتوبات کے مطالعے سے ان کے صوفیانہ طریق و مسلک کی درج ذیل صفات اور خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں:

(۱) سلوک کا حاصل یہ ہے کہ سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی چیز مقصود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو شرک سے نفرت ہے، لاالٰہ الا اللہ کا مطلب یہی ہے کہ: لا مقصود الا اللہ۔[۵۹]

(۲) ''مکتوبات امام ربانی'' بہ طور نصاب۔ بالفاظ دیگر عرفانی احوال کو سمجھنے اور سلوک کی مسائل کو حل کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات ہی سے استناد اور اسی کی روشنی میں اصلاح کی جائے۔[۶۰]

(۳) ذکر پر مداومت،[۶۱] اس لیے کہ بغیر کثرتِ ذکر کے ماسویٰ سے نسیان نہیں ہوتا اور بغیر نسیان ماسویٰ کے کام نہیں بنتا۔[۶۲] ایک خط میں ذکر کا مفصل طریقہ مذکور ہے۔[۶۳]

(۴) ذکر کے وقت تصور شیخ اکسیر اعظم ہے۔[۶۴]

(۵) بے وضو رہنے سے احتراز۔[۶۵]

(۶) عرفان و سلوک کی منازل میں ترقی اور صعود میں سالک و طالب کی محنت سے زیادہ اوپر کے پیرانِ طریقت کی برکت اور ان کے ساتھ محبت کو دخل ہے۔[۶۶]

(۷) صحبت کے تاثیرات بے شمار ہیں۔ طریقہ نقشبندیہ میں مدار ترقی صحبت پر ہے۔[۶۷]

(۸) جب بھی کسی قسم کی کوئی پریشانی پیش آئے تو ختمِ خواجگان و ختمِ حضرت مجدد پڑھ کر دعا مانگنا چاہیے اور پانی دم کر کے وہی پانی پلانا چاہیے کہ وہ ''اکسیر اعظم'' ہے۔[۶۸]

(۹) بزرگوں کی غلامی کا طوق گلے میں رہے۔[۶۹]

(۱۰) بزرگوں کے مزارات کی زیارت کے سفر کے لیے جانا باعث برکت ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سفر کامیاب رہا، جاتے وقت حضرت امام ربانی اور حضرات پیرانِ طریقت کے مزاراتِ متبرکہ کی زیارت کے لیے سرہند اُتر گیا تھا، ان ہی حضرات کی برکات سے یہ سفر اس طرح ختم ہوا، فللّٰہ الحمد علیٰ ذلک۔''[۷۰]

[۹] اسلوبِ تحریر

مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی نے دینی علوم کی مختلف جہات کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ اس میں اگر ایک طرف تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف جیسے ادق علمی عنوانات شامل ہیں تو دوسری جانب صحافت اور سوانح نگاری جیسے ہلکے پھلکے اور عام فہم اندازِ تحریر کے متقاضی موضوعات بھی داخل ہیں۔ مشکل ترین کلامی اور مناظرانہ علمی مسائل کو شائستہ اور سلیس انداز میں قاری کے لیے لائق تفہیم بنا دینا مولانا لکھنوی کی تحریروں کا اختصاص ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ مولانا لکھنوی کی اکثر

تصانیف کتابی شکل میں طبع ہونے سے پہلے ''النجم'' میں قسط وار شائع ہوتی تھیں۔ رسالے اور اخبار کے قارئین بالعموم عوام ہوتے ہیں، اس لیے قاموسی اور اصطلاحی اندازِ تحریر اس کے افادے کو محدود کر دیتا ہے۔ مولانا لکھنوی جس زمانے میں ان علمی موضوعات پر اپنے عام فہم اسلوب میں لکھ رہے تھے، چند ایک کو مستثنیٰ کر کے، اس عہد میں علماء کی تحریریں ٹھیٹھ منطقی انداز اور صرفی و نحوی تراکیب سے گراں بار ہوا کرتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عام فہم انداز میں لکھنا اصحابِ علم کی شان کے شایاں نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مولانا لکھنوی کا یہ رواں دواں اُسلوب کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط میں بھی جلوہ گر ہے۔ نماز کی ابتدا اور انتہا کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نماز کی ابتدا اور انتہا میں شارع نے اپنی حکمتِ بالغہ سے کچھ ایسی بات رکھ دی ہے کہ خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے تازیانہ عبرت کا کام دے، مگر چشمِ بینا اور دلِ دانا کی ضرورت ہے، مثلاً نماز کی ابتدا میں شارع نے تکبیرِ تحریمہ رکھی ہے اور اس تکبیرِ تحریمہ کے لیے یہ پاکیزہ لفظ تجویز کیا: ''اللہ اکبر''، یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ لفظ اللہ کی بڑائی سب پر بتلا کر نمازی کو بیدار کرنے اور ماسوی اللہ سے تعلقات کے خالی کرنے کی طرف ہدایت کر رہا ہے، اس لیے فطری بات ہے کہ جب انسان کسی بڑے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کو چھوٹوں کی یاد بھی نہیں آتی۔ اس حالت میں ایک صاحبِ دل فرماتے ہیں۔

نہیں ممکن کہ خطرہ غیر کا دل میں کبھی آئے
کسی کی یاد میں سب کچھ بھلانا اس کو کہتے ہیں [۱۲]

ان عام فہم دعوتی اسالیب کے ساتھ ساتھ مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کبھی کبھی انشاء پردازی بھی فرماتے تھے، ایسی انشاء پردازی جو حقیقت پر مبنی ہے، جسے محض خیال آفرینی کے نقلی رنگوں سے پُر نہ کیا گیا ہو۔ مولانا قاری محمد طیب قاسمی (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) کے نام ایک خط میں دیوبند اور اربابِ دیوبند بالخصوص مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو ان فرشتہ خصلت مخلصوں کا اخلاص کچھ ایسا پسند آیا کہ ان کے فیوض و برکات اور علم و عمل کو دوام اور استمرار بخشا، یعنی تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں ولی اللّٰہی ابر نیساں ''نانوتہ'' پر برسا جہاں کی خاک سے قدرت نے اسی جامعیت کی اہلیت کا حامل ایک ''قاسم العلوم'' پیدا فرمایا۔ وہاں سے جو ہلال طلوع ہو کر اُفقِ دہلی پر ضوفشاں ہوا تھا، وہ ''بدرِ کامل'' بن کر دیوبند میں چمکا، جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب حنفی علیہ الرحمہ کی ذات بابرکات تھی۔ اس مجسمِ علم اور پیکرِ عقل نے، جو ولی اللّٰہی خزانۂ علم کا

امین تھا، دنیائے اسلام کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ چمنِ محمدی کا ہر شجر اندرونی معصیت و غفلت اور بیرونی شرک و کفر کے بادِ سموم سے پژمردہ ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ کوہِ وقار تڑپ گیا اور معاً میدانِ عمل میں گامزن ہوا۔''[۲۷]

[۱۰] ذوقِ شعر و سخن

لطیف مزاج آدمی طبعی طور پر شعر و سخن کا دل دادہ ہوتا ہے۔ جمالیاتی احساس ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے، شعری ذوق بنیادی طور پر اس احساس کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ ذوقِ شعری ہی کی بدولت فہمِ لفظ اور ادراکِ معانی بھی عطا ہوتا ہے۔ مولانا لکھنوی کاکوری میں پیدا ہوئے۔ آپ اہلِ زبان تھے۔ آپ کے والد مولانا ناظر علی ناظر خود ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ مولانا لکھنوی کو عربی اور فارسی پر مکمل عبور حاصل تھا، تصوف، جو انسان کی لطافت کو اُبھارتا ہے، سے نظری اور عملی دونوں طرح کا اشتغال رکھتے، اتنی خوبیوں اور صفات کا حامل عالم کیسے ممکن ہے کہ ذوقِ شعری سے نابلد ہو۔ مولانا لکھنوی نے اپنی تالیفات میں موقع و محل کی مناسبت سے اردو اور فارسی کے جو اشعار درج کیے انھیں پڑھ کر ان کے بلند شعری ذوق کا پتا چلتا ہے۔ ''مدحِ صحابہؓ'' پر مشاعروں کا انعقاد بھی، جو اُردو ادب کے ذخیرے میں ایک مستقل اضافہ ہے، آپ کے لطیف شعری ذوق کا عکاس ہے، ان سب کے باوجود مولانا لکھنوی کے اپنے کہے ہوئے اشعار کہیں نہیں ملتے، جس سے نثر کی طرح فنِ شعر و نظم میں بھی آپ کے کمال کا اندازہ کیا جا سکے۔ البتہ اس میں ایک استثنٰی ہے اور وہ یہ کہ مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی سیوان کا تبلیغی سفر فرمایا کرتے تھے، اہلِ سیوان آپ سے نہایت محبت اور تعلق کا اظہار فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ سفرِ سیوان سے واپسی پر آپ نے وہاں کے احباب اور عقیدت مندوں کے تعلق سے متاثر ہو کر فارسی میں چند اشعار کہے اور اُنھیں لکھ کر بھیجے تھے۔[۳۸]

[۱۱] دنیا سے بے رغبتی

کتاب و سنت کی تعلیمات کے بہ موجب دنیا سے بہ قدرِ کفاف تمتع بندگی کا لازمہ ہے۔ جو شخص راہِ سلوک کا راہ نورد ہونے کا دم بھرتا ہو اور پھر دنیا اور اسباب و آسائش دنیا میں گلے گلے تک ڈوبا ہوا ہو، ایسا شخص اپنے دعوے میں سچا کہلا سکتا ہے اور نہ کبھی مراد کو پا سکتا ہے۔ ایسا شخص دنیا ہی کو مقصدِ حیات سمجھتے ہوئے موت سے گھبراتا ہے۔ مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی قرآن و سنت پر گہری نظر رکھنے والے

باعمل عالم اور باصفا صوفی تھے، اس لیے وہ دنیا کی حقیقت اور اس سے تمتع کی حدود سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ اپنے ایک خط میں ایسے لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''مبارک ہیں وہ لوگ جو اس دنیا کی حقیقت کو سمجھ گئے اور مرنے سے پہلے انھوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا۔''[۷۴]

ایسا شخص موت سے بے خوف ہوتا ہے، اس لیے کہ ایسے شخص کے لیے موت دوست کی دوست سے ملاقات کا پل ہوتی ہے، مولانا لکھنوی ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دنیا سے جانا سب کو ہے، مگر موت سے ڈرنا نہ چاہیے۔ ہاں! اپنے گناہوں کا خوف ضرور ہے، لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت اور بزرگانِ دین کے توسل کی برکت سے قوی امید ہوتی ہے۔''[۷۵]

انتقال کے بعد آپ نے ترکے میں بہت ہی کم سامان چھوڑا۔[۷۶]

آپ نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر احباب کے نام جو تعزیتی مکتوب تحریر فرمایا تھا، اس کے آخر میں اپنی اولاد کے نام جو وصیت نامہ لکھا ہے، اس کا لفظ لفظ دنیا کی حقیقت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں اپنی اولاد کو نصیحت کرتا ہوں کہ دنیا کو اپنا گھر اور وطن نہ خیال کریں، دنیا کی زندگی کو حالت سفر سمجھتے رہیں، جو کام کریں صرف حق تعالیٰ کی رضامندی کے لیے کریں۔ اپنی زندگی کا نصب العین دین اسلام کی خدمت کو قرار دیں اور کسبِ معاش کی فکر میں اپنا وقت بہت کم خرچ کریں۔ میں اپنے دوستوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر خدانہ خواستہ میری اولاد میں سے کسی کو میری نصیحت کے خلاف پائیں تو ان سے مواخذہ کریں۔ باقی سب کچھ حق تعالیٰ کے سپرد ہے۔''[۷۷]

حرفِ آخر

خطوط یوں تو کسی شخص کے ذاتی خیالات اور باطنی احساسات کے عکاس ہوتے ہیں، لیکن دینی اور علمی شخصیات کے قلم سے نکلے خطوط ان صفات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد اور معاشرے کے پورے دینی، علمی، اور تاریخی منظر نامے کے بھی ترجمان ہوتے ہیں۔ مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی اپنے خطوط میں ایک بالغ نظر عالم و محقق، صاحبِ رشد شیخ، مشاق مناظر، مقبول مصنف اور صحافی ہونے کے ساتھ ایک نہایت عالی اخلاق اور دل بینا سے بہرہ مند ایک انسان بھی نظر آتے ہیں۔ ایک ایسے انسان جنھیں اپنے متعلقین کی مستقل فکر اور

ان کی راحت رسانی کا خیال رہتا ہے۔ تعلق مع اللہ اور معمولات کی پوری پابندی کے ساتھ اپنے وقت کو کار آمد بنانے کا استحضار اور متعلقین کو اس کی تلقین ان خطوط کی سطر سطر سے نمایاں ہیں۔ حساس ترین متکلمانہ موضوعات پر لکھتے ہوئے بالعموم قلم اور افکار کا جادہ اعتدال پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کا رہوارِ قلم نازک ترین مقامات پر بھی حسنِ اعتدال کا مظہر اور حساس ترین موضوعات میں بھی ادب آشنا رہتا ہے۔ ان کے افکار میں، اتفاق یا اختلاف سے قطع نظر، تمام تر تحقیقی ندرت کے باوجود مجمع علیہ اور متفقہ مسائل میں ''انفرادیت'' یا ''تفرد'' کا دور دور تک شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ الغرض یہ خطوط بیسویں صدی کے ہندستان کے دینی و علمی موضوعات اور اس عہد میں پیش آمدہ واقعات، نزاعی مسائل اور زیرِ بحث موضوعات کی مبسوط تاریخ فراہم کرتے ہیں۔

تاہم ابھی مزید خطوط کی دست یابی کا قوی امکان ہے۔ ''مکتوباتِ امامِ اہلِ سنت'' کو اس سلسلے کا ''نقشِ اولیں'' یا ''سنگِ میل'' کہا جا سکتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱- مولانا رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، لاہور: المکتبۃ السلفیہ، ۱۹۵۵ء؛ مولانا سید مناظر احسن گیلانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، لاہور: دوآبہ پریس، ۱۹۴۶ء؛ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مشمولہ تاریخ دعوت و عزیمت، کراچی: مجلس نشریات اسلام، (س-ن)، جلد ۵؛ مولانا محمد منظور نعمانی (مرتب)، ماہ نامہ "الفرقان" (بریلی)، شاہ ولی اللہ نمبر، ۱۹۴۱ء؛ مولانا سید محمد میاں، علمائے ہند کا شاندار ماضی، کراچی: مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۶۸ء، صفحات ۱-۸۳؛ مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، لاہور: سندھ ساگر اکادمی، ۲۰۱۶ء؛ مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، کراچی: سندھ ساگر اکادمی؛ مولانا محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۴ء؛ غلام حسین جلبانی، شاہ ولی اللہ کی تعلیم، کراچی: سندھ ساگر اکادمی، ۲۰۱۷ء؛ پروفیسر محمد سرور، ارمغان شاہ ولی اللہ: شاہ ولی اللہ کی تعلیمات و افکار اور سوانح حیات، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء؛ ڈاکٹر مظہر بقا، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، کراچی: بقا پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء؛ ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی خدمات، لاہور: المحمود اکیڈمی، ۱۹۹۸ء؛ مفتی محمد عبیداللہ الاسعدی، فقہ ولی اللّٰہی: امام ولی اللہ دہلوی کا فقہی مسلک و مذہب اور خدمات و اثرات و ثمرات، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۲۰۰۴ء؛ محمد اکرام چغتائی، شاہ ولی اللہ: سوانح، تصنیفات وغیرہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء؛ مولانا عبدالحئ الحسنی، الإعلام بمن في تاریخ الہند من الأعلام، بیروت: دار ابن حزم، ۱۹۹۹ء، جلد ۲ صفحات ۸۵۸-۸۶۷۔

J.M.S. Baljon, Religion and Thought of Shah Wali Allah Dihlawi, Leiden: E. J. Brill, 1986

Marcia K. Hermansen, Shah Wali Allah of Delhi's Hujjat Allah al-Baligha (The Conclusive Argument from God), Islamabad: Islamic Research Institute 2003; Marcia K. Hermansen, Shah Wali Allah of Delhis Treatises on Islamic Law Louisville, KY: Fons Vitae, 2010; Marcia K. Hermansen, "Shah Wali Allah's Arrangement of the Subtle Spiritual Centers", Studies in Islam, July 1982, pp. 137-150; Marcia K. Hermansen, "Shah Wali Allah of Delhi's Hujjat Allah al-Baligha: Tension Between the Universal and the Particular in an Eighteenth Century Islamic Theory of Religion", Studia Islamica, fascicle 63, 1986, pp. 143-157; Marcia K. Hermansen, "Shah Wali Allah's Theory of the Subtle Spiritual Centers (Lata'if): A Sufi Model of Personhood and Self-Transformation", Journal of Near Eastern Studies 47 (1, January 1988): pp. 1-25;

Muhammad Ikram Chaghatai, Shah Waliullah (1703 - 1762): his Religious and Political Thought, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2005.

۲- مولانا عبدالباری فرنگی محل، آثار الاول من علمائے فرنگی محل، لکھنؤ: مطبع مجتبائی، سن-ن؛ مولانا شیخ الطاف الرحمٰن، احوال علمائے فرنگی محل، لکھنؤ: مطبع مجتبائی، س-ن؛ مولانا مفتی محمد عنایت اللہ، تذکرہ علمائے فرنگی محل، کراچی (عکسی طبع ثانی)، ماس پرنٹر و پبلشرز، سن-ن؛ علمائے فرنگی محل: حیات و خدمات، دہلی: ایفا پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، (مجموعہ مقالات، سیمینار زیر اہتمام اسلامک فقہ اکیڈمی، منعقدہ ۲۰-۲۲ مئی ۲۰۱۱ء)؛ مولانا یٰسین اختر مصباحی، ممتاز علمائے فرنگی محل، لکھنؤ، کوشی نگر: مکتبہ ایوبیہ، خانقاہ قادریہ، ایوبیہ، ۲۰۱۷ء

۳- مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکلام، (ترجمہ: مولانا محمد یونس، مونس اویسی)، بریلی: جامعۃ الرضا، ۲۰۰۸، صفحہ ۷۴۳

۴- خلافت عثمانیہ کے "امین المشیخۃ" شیخ محمد زاہد الکوثری (۱۳۰۶ھ-۱۳۷۱ھ/۱۸۸۹ء-۱۹۵۲ء) کے شاگرد اور جانشین استاذ عبدالفتاح ابوغدہ (۱۳۳۵ھ-۱۴۱۷ھ/۱۹۱۷ء-۱۹۹۷ء) نے مولانا عبدالحئی فرنگی محل کو عالم عرب میں سب سے زیادہ متعارف کروایا ہے۔ شیخ ابوغدہ نے مولانا عبدالحئی فرنگی محل کی چھ تصانیف اپنی تحقیقات و تعلیقات کے ساتھ عالم عرب سے شائع کی ہیں۔ شیخ ابوغدہ کا بیان ہے کہ ان کے استاذ شیخ محمد زاہد الکوثری اپنے تلامذہ کو مولانا عبدالحئی کی کتابوں کے مطالعے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ (مولانا عبدالحئی لکنوی، الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل، تحقیق: عبدالفتاح ابوغدہ، طبع حلب، ۱۳۸۸ھ، صفحہ ۱۱)؛ علمائے حجاز کی سندات اور اجازات کے لیے دیکھیے: مولانا محمد عبدالباقی، حسرۃ الفحول بوفاۃ نائب الرسول، لکھنؤ: مطبع انوار محمد، ۱۳۰۶ھ؛ مولانا محمد حفیظ اللہ اعظمی، کنزالبرکات فی سیرۃ أبی الحسنات، لکھنؤ: مطبع علوی، ۱۳۵۰ھ، صفحہ ۴۱؛ غلام مرسلین، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی: حیات و خدمات: علی گڑھ: مرکز دراسات ایشیائے غربی، مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۸۵ء، صفحات ۲۲-۳۲؛ ۸۳-۸۴۔

۵- دانشوران فرنگ میں ایک اہم نام پروفیسر فرانسس رابنسن (Francis Robinson) کا ہے۔ مستشرق موصوف جنوبی ایشیا کی اسلامی تاریخ کے محقق اور اس موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فرانسس رابنسن نے علمائے فرنگی محل کی علمی اور ثقافتی خدمات کو ایک مستقل کتاب کی صورت میں موضوع تحقیق بنایا ہے۔ اس کتاب میں علمائے فرنگی محل کی خدمات کے اثرات کو: "How the influence of Farangi Mahall was Spread and Maintained" کے زیر عنوان تفصیل سے نکات وار بیان کیا ہے۔ اسی ضمن میں فرنگی محل کے ایک فرد فرید مولانا عبدالحئی فرنگی محل کی تصانیف کی شہرت اور مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے سویت یونین کے مفتی اعظم باباضیاء الدین خانوف کے متعلق لکھتے ہیں:

We not too, that when Baba Ziya al-Din Khanov, Grand Mufti of Soviet Union, came to Lucknow in 1965, he especially asked to visit Farangi Mahall in order to see the house of Mawlana 'Abd al-Hayy whose books he used in Tashkent.

[Francis Robinson, The 'Ulama of Farangi Mahall and Islamic Culture in South Asia, London: Hurst and Company, 2001, p. 116]

۶- مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی کے احوال کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے:
مولانا عبدالحئ الحسنی، الإعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام، الجزء الثامن، صفحہ ۱۳۱۶؛ پروفیسر محمد عبدالحئ فاروقی، ماہ نامہ برہان، دہلی، اپریل ۱۹۷۵ء؛ ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، مارچ ۱۹۹۳ء

۷- پروفیسر محمد عبدالحئ فاروقی، امام اہل سنت حضرت علامہ محمد عبدالشکور فاروقی لکھنوی: حیات و خدمات، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ اہل سنت، ۲۰۰۹ء، صفحہ ۸۱۲

۸- محولہ بالا، صفحہ ۵۱۱

۹- نو آبادیاتی نظام کے زمانے میں برعظیم کی ملت اسلامیہ دوسروں کے مقابلے میں نظم سیاست سے لے کر نظام تعلیم تک سب ہی دیگر اقوام و ملل کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوئی۔ مسیحی مشنریوں، آریہ سماجیوں، سکھوں نے اور بالخصوص شدھی و سنگھٹن تحریکیں اپنے اپنے مذہب کی ترویج اور اہل اسلام سے ہر طرح کے مقابلے کے لیے پوری طرح سرگرم تھے۔ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً حکومت منحرف فرق و مذاہب کو حکومت کی مزعومہ ''مذہبی آزادی'' اور ''رواداری'' نے اسلام کے نام پر اپنی تعلیمات کی نشر و فروغ کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ ان کی سرپرستی بھی کی گئی۔ ایسی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے علماء و طلبا کے مدارس میں جس قسم کی علمی استعداد، دیگر ادیان و فرق کی کتابوں سے، ماہرانہ واقفیت اور ان کے اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات دینے کی لیاقت اور خود اعتمادی کی ضرورت تھی وہ متذکرہ حالات کی تنگیوں کے باعث مسلسل کمزور پڑتی جا رہی تھی، چہ جائیکہ وہ ان نظریات کے آگے بند باندھ سکتے، ان ہی اسباب کی بنا پر مولانا عبدالشکور لکھنوی نے مدارس کے فضلا کی تربیت کے لیے ۲/ذیقعدہ ۱۵۳۱ھ/۲۳۹۱ء کو لکھنؤ میں ایک ادارے ''دار المبلغین'' کی بنیاد رکھی، اس کا دو سالہ مستقل نصاب تشکیل دیا گیا جس میں بنیادی اہمیت قرآن مجید کو دی گئی۔ اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے گلی محلے کی سطح پر انجمنیں بنائی گئیں، آریہ، قادیانی اور روافض مسیحی مبلغین کا مقابلہ کرنے کے لیے مناظرین تیار کیے گئے، شعبہ نشر و اشاعت قائم کیا گیا۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ تھے:

(الف) اہل سنت کے اندر صحیح مذہبی واقفیت پیدا کر کے ان کو پابند مذہب بنانے کی سعی کرنا۔

(ب) غیر شرعی اعمال کی وجہ سے جو دینی، اخلاقی اور سماجی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، اہل سنت کو ان سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد کرنا۔

(ج) تحریر و تقریر کے ذریعے اسلام کے محاسن و مکارم کی تبلیغ و اشاعت کرنا۔

تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر محمد عبدالحئ فاروقی، محولہ بالا، صفحات ۴۳۱-۷۵۱۔

۱۰- تبرا ایجی ٹیشن کی تفصیل کے لیے دیکھیے: محولہ بالا، صفحات ۳۳۳-۸۳۳۔

۱۱- تحریکِ مدحِ صحابہؓ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: محولہ بالا، صفحات ۳۱۲-۵۶۳

۱۲- مولانا سید حسین احمد مدنی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علمائے ہند)، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی (مفتی اعظم و سابق صدر جمعیۃ علمائے ہند)، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد (نائب امیر شریعت بہار)، مولانا قاری محمد طیب قاسمی

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)، اور دیگر مقتدر اور سیاسی شخصیات نواب زادہ لیاقت علی خان (سیکریٹری جنرل مسلم لیگ)، حاجی نثار اللہ (رکن اسمبلی)، مولوی فصیح الدین (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، جون پور) ان رہنماؤں کے بیانات اور تقاریر کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے:

۱۳- محولا بالا، صفحہ ۲۲۰-۳۶۵

۱۴- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی کے سوانح نگار نے مولانا لکھنوی کی نام بہ نام ایک سو بارہ تصنیفات، تالیفات اور تراجم گنوا اور ان پر تبصرے کر کے آخر میں لکھا ہے: "ہو سکتا ہے کہ ابھی کچھ اور بھی کتابیں اور رسائل بھی ہوں، مگر وہ ہمارے علم میں نہیں ہیں۔" محولہ بالا، صفحہ ۵۹۰

۱۵- محولہ بالا، صفحہ ۲۲۵

۱۶- محولہ بالا، صفحہ ۷۴۵

۱۷- ہفت روزہ "حرم"، لکھنؤ، امام اہلِ سنت نمبر، ۱۹۶۴ء؛ ماہ نامہ "البدر"، کاکوری، امام اہلِ سنت نمبر، جولائی-اگست ۱۹۸۱ء

۱۸- مولانا محمد منظور نعمانی، "حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی مجددی"، مشمولہ تحدیث نعمت، (مرتب: عتیق الرحمن سنبھلی)، لاہور: قریشی پبلشرز، س-ن، صفحات ۳۳۸-۳۵۲؛ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، "مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی"، مشمولہ پرانے چراغ، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س-ن، جلد ۲ صفحات ۲۱۵-۲۲۴

۱۹- برعظیم کے علمی منظر نامے میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱ھ-۷۸۲ھ/۱۲۶۳ء-۱۳۸۱ء) کے "مکتوبات صدی"، حیدرآباد: شاہ لطیف آباد، (س-ن)؛ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۷ھ-۱۰۵۱ھ/۱۵۵۱ء-۱۶۴۲ء) کے "مکتوبات شیخ عبدالحق محدث دہلوی"، (مترجم: مولانا محمد فاضل)، دہلی: نور پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۰ء؛ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (۹۷۱ھ-۱۰۳۳ھ/۱۵۶۴ء-۱۶۲۴ء) کے "مکتوبات امام ربانی"، کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، (س-ن)؛ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ/۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کے "نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی"، (فراہم کردہ: شاہ محمد عاشق پھلتی: تحقیق و ترجمہ: مولانا نسیم احمد فریدی)، پھلت: شاہ ولی اللہ اکادمی ۱۹۹۸ء؛ سید احمد شہید (۱۲۰۰ھ-۱۲۴۶ھ/۱۷۸۶ء-۱۸۳۱ء) کے "مکاتیب سید احمد شہید" لاہور: مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۷۵ء؛ مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۷ھ-۱۲۹۷ھ/۱۸۳۲ء-۱۸۸۰ء) کے "قاسم العلوم"، دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۲۹۲ھ؛ مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۲۴۴ھ-۱۳۲۳ھ/۱۸۲۹ء-۱۹۰۵ء) کے "مکتوبات رشیدیہ"، لاہور: المکتبۃ المدنیہ، ۱۹۸۳ء؛ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ/۱۸۶۳ء-۱۹۴۳ء) کے "اشرف المکتوبات"، کراچی: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، ۲۰۰۰ء؛ مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۲۹۶ھ-۱۳۷۶ھ/۱۸۷۹ء-۱۹۵۷ء) کے "مکتوبات شیخ الاسلام" (مرتب: مولانا نجم الدین اصلاحی)، کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۱۹۹۴ء؛ مولانا عبیداللہ سندھی (۱۲۸۸ھ-۱۳۶۳ھ/۱۸۷۲ء-۱۹۴۴ء) کے "مکاتیب مولانا عبیداللہ سندھی"، (مرتب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری)، کراچی: مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی؛ مولانا محمد الیاس کاندھلوی (۱۳۰۲ھ-۱۳۶۳ھ/۱۸۸۵ء-۱۹۴۴ء)

کے ''مکتوبات مولانا محمد الیاس، (مرتب: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)، کراچی: دارالاشاعت، اس سلسلے کی نمایاں مثالیں ہیں۔

۲۰- یہ خطوط دارالعلوم کراچی کے ترجمان ماہ نامہ ''البلاغ'' کی دو مسلسل اشاعتوں (پہلی قسط: محرم ۱۳۸۸ھ اور دوسری قسط ماہ صفر ۱۳۸۸ھ) میں شائع ہوئے تھے۔

۲۱- ''تذکار بگویہ'' (جلد سوم)، سرگودھا: مجلس مرکزیہ، حزب الانصار، جامع مسجد بھیرہ، ۲۰۱۴ء، صفحات ۲۲۸-۲۲۹؛ ۲۸۳

۲۲- پروفیسر محمد عبدالحئی فاروقی، محولہ بالا، صفحہ ۳۹۵

۲۳- محولہ بالا، صفحہ ۳۹۵

۲۴- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، ''برائے عامۃ المسلمین متعلقہ نماز''، مشمولہ مکتوبِ امام اہلِ سنت، (مرتب: پروفیسر محمد عبدالحئی فاروقی)، لاہور: دارالکتاب، ۲۰۱۹ء، صفحہ ۳۳

۲۵- محولہ بالا، صفحہ ۴۲

۲۶- محولہ بالا، صفحہ ۴۳

۲۷- محولہ بالا، صفحہ ۵۴

۲۸- محولہ بالا، صفحہ ۵۶

۲۹- محولہ بالا، صفحہ ۵۷

۳۰- محولہ بالا، صفحہ ۶۰

۳۱- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''شیخ فریدالدین سلطان پوری''، محولہ بالا، صفحہ ۲۹۶

۳۲- محولہ بالا، صفحہ ۲۷۶

۳۳- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''حاجی محمد اسمٰعیل انصاری و حاجی شکراللہ انصاری''، محولہ بالا، صفحہ ۱۷۵

۳۴- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''شیخ فریدالدین سلطان پوری''، محولہ بالا، صفحہ ۲۹۶

۳۵- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''شیخ فریدالدین سلطان پوری''، محولہ بالا، صفحہ ۲۹۷

۳۶- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی''، محولہ بالا، صفحہ ۲۰۰

۳۷- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''شیخ فریدالدین سلطان پوری''، محولہ بالا، صفحہ ۲۹۹

۳۸- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''محدث جلیل علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی''، محولہ بالا، صفحات ۱۳۸-۱۳۹

۳۹- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی''، محولہ بالا، صفحہ ۲۴۸

۴۰- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''داستانِ غم یا شامِ غریباں: برائے اہل خاندان و عامۃ المسلمین''، محولہ بالا، صفحات ۳۲۲-۳۳۰

۴۱- مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''جناب سید معشوق علی سلطان پوری ایڈوکیٹ''، محولہ بالا، صفحہ ۱۹۱

۴۲- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "محدث جلیل علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی"، محولہ بالا، صفحہ ۱۴۶

۴۳- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۷۷

۴۴- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "محدث جلیل علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی"، محولہ بالا، صفحہ ۱۳۱

۴۵- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۶۰

۴۶- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۳۲

۴۷- سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، رقم ۲۵۰۴

۴۸- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "جناب سبط حسن"، محولہ بالا، صفحہ ۳۵۷-۳۵۸

۴۹- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی مکتوب بہ نام "حکیم سید شبیر حسن بہاری، بہرائچ"، محولہ بالا، صفحہ ۱۰۶

۵۰- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "حکیم سید شبیر حسن بہاری، بہرائچ"، محولہ بالا، صفحہ ۱۰۵

۵۱- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی مکتوب بہ نام "حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی"، محولہ بالا، صفحات ۹۲-۹۳

۵۲- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، خطوط بہ نام "جناب قسیس جان قلندر، مبلغ مذہب مسیحی"، محولہ بالا، صفحات ۳۴۱-۳۵۴

۵۳- ان تینوں بزرگوں کے خود پر پڑنے والے اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبد الشکور لکھنوی لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے حضرات نقشبندیہ مجددیہ کے تین بلند پایہ بزرگوں کی صحبت عطا فرمائی اور تینوں کا سلسلہ حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحب قدس سرہٗ سے ہے۔ اول والدی الماجد رحمۃ اللہ علیہ، دوم حضرت مولانا سید محمد عین القضاۃ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سوم حضرت ولی مرشد وسیلتنا الی اللہ الصمد حضرت مولانا شاہ عبد اللہ ابو احمد رحمۃ اللہ علیہ، بیعت صرف ان ہی سے تھی۔" (مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، شجرہ طیبہ، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳۳)

۵۴- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۵۷

۵۵- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۳۷

۵۶- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۲۲

۵۷- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۳۹

۵۸- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "سید معشوق علی سلطان پوری، ایڈوکیٹ"، محولہ بالا، صفحہ ۱۹۱

۵۹- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۲۵

۶۰- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "احباب و متوسلین"، محولہ بالا، صفحہ ۲۶

۶۱- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۲۰

۶۲- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی"، محولہ بالا، صفحہ ۲۴۷

۶۳- مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام "مولانا حکیم عبد الغنی فاروقی"، محولہ بالا، صفحات ۲۳۵-۲۳۷

۶۴- محولہ بالا، صفحہ ۲۳۷

۶۵-مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی''، محولہ بالا، صفحہ ۲۲۰

۶۶- محولہ بالا، صفحہ ۱۲۲

۶۷- محولہ بالا، صفحہ ۲۳۰

۶۸-مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی''، محولہ بالا، صفحہ ۲۵۷

۶۹- محولہ بالا

۷۰- محولہ بالا، صفحہ ۲۳۹

۷۱-مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، ''برائے عامۃ المسلمین متعلقہ نماز''، محولہ بالا، ۵۹

۷۲-مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی''، محولہ بالا، ۱۱۹

۷۳-اشعار کے لیے دیکھیے: مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''حافظ محمد صدیق سیوانی''، محولہ بالا، صفحات ۱۶۹-۱۷۰

۷۴-مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''محدث جلیل علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی''، محولہ بالا، ۱۴۵

۷۵-مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، مکتوب بہ نام ''مولانا حافظ مغیث الدین احمد الٰہ آبادی''، محولہ بالا، ۲۷۲

۷۶-ترکے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر محمد عبدالحیٔ فاروقی، امام اہل سنت حضرت علامہ محمد عبدالشکور لکھنوی: حیات وخدمات، محولہ بالا، صفحہ ۶۷۹

۷۷-مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی، ''داستانِ غم یا شامِ غریباں: برائے اہل خاندان وعامۃ المسلمین''، محولہ بالا، ۳۳۰